لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ کی تفسیر

از

سیدنا حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ کی تفسیر

(فرمودہ ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء بمقام مسجد احمدیہ لاہور)

میں نے ایک دفعہ ایک رؤیا دیکھا تھا جسے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ اس کے اندر اخلاقی اور روحانی سبق دیا گیا ہے۔ چونکہ اس موقع کے لحاظ سے بھی وہ اس قابل ہے کہ اس کے ذکر سے میں اس وقت تقریر شروع کروں اس لئے اس کا ذکر کرتا ہوں۔

میں نے رؤیا دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ جو نہایت خوبصورت، نہایت حسین، نہایت پاکیزہ اور نہایت ذکی ہے۔ جس کے چہرہ سے نور کی شعاعیں نکلتی اور جس کی آنکھوں سے ذہانت اور شرافت ٹپکتی ہے۔ آٹھ نو سال کی عمر ہے اور نہایت خوبصورت لباس پہنے ہوئے ہے۔ ایک سنگِ مرمر کا چبوترہ ہے جس کے ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہ بچہ دوسری یا تیسری سیڑھی پر کھڑا اوپر ہاتھ اٹھائے اور سر جھکائے دعا مانگ رہا ہے۔ تب میں نے دیکھا بادلوں میں سے ایک حسین عورت جس کے لباس کے رنگ غیر معمولی شوخی اور خوبصورتی رکھتے ہیں اور نہایت خوشنما رنگوں والے پر رکھتی ہے، نیچے اتری اور بچے پر جُھک کر اسے پیار کرنے لگی۔ اس وقت مجھے بتایا گیا کہ بچہ حضرت مسیح ہے اور عورت حضرت مریم۔ تب میری زبان پر یہ فقرہ جاری ہو گیا LOVE CREATES LOVE محبت محبت پیدا کرتی ہے۔

یہ ایک نہایت ہی زبردست صداقت ہے کہ محبت قلوب کے نہایت باریک خانوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ آواز کے لحاظ سے یہ سب سے زیادہ خاموش چیز ہے، لیکن اثرات کے لحاظ سے سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہ شخص جس کی آنکھ محبت کے باریک اثرات دیکھنے کی قابلیت

نہیں رکھتی' وہ تمام عالم میں سکون اور خاموشی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن محبت کے جذبات اتنا عظیم الشان تلاطم اندر ہی اندر پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ کان جو محبت کے اثرات سننے سے نا آشنا اور وہ آنکھیں جو محبت کی حرکات دیکھنے سے قاصر ہوتی ہیں' وہ بھی حیران رہ جاتی ہیں۔

میں نے اس کے اثرات کو دیکھا اور بار ہا دیکھا ہے۔ بیسیوں دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نہایت کمزوری اور نقاہت کی حالت میں دوستوں کی مجلس میں آیا اور اس خیال اور اس وثوق سے آیا کہ اس قلیل عرصہ میں کوئی موقع ایسا پیدا نہیں ہو سکتا کہ دوست مجھ سے باتیں سننے کی جو خواہش رکھتے ہیں' وہ پوری کی جا سکے۔ لیکن ایک مخفی ہاتھ نے اور اس مخفی ہاتھ نے جو گرے ہوئے کو اٹھاتا اور کمزور کو سہارا دیتا ہے' میری حالت میں تغیر پیدا کر دیا اور خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ میں تقریر کروں اور دوستوں کو روحانی اور جسمانی تربیت کے متعلق باتیں سناؤں۔

اسی جلسہ سالانہ پر ایک صاحب نے جو یوں تو کئی سال سے ملتے ہیں مگر ابھی تک غیر احمدی ہیں مجھ سے سوال کیا کہ میں نے کئی بار دیکھا ہے آپ بیمار اور کمزور ہوتے ہیں مگر پھر لمبی لمبی تقریریں بھی کرتے ہیں۔ آپ کو کس قسم کی بیماری ہے جس کی آپ کوئی پرواہ نہیں کرتے اور اتنی مشقت برداشت کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا مجھے بیماری تو اسی قسم کی ہوتی ہے جس قسم کی دوسرے لوگوں کو ہوتی ہے مگر موقع پر خدا تعالیٰ طبیعت میں ایسا تغیر پیدا کر دیتا ہے کہ میں تقریر کے لئے کھڑا ہو جاتا ہوں اور پھر وہ خیالات کے اظہار کی توفیق بھی عطا کر دیتا ہے۔

میں آج بھی ارادہ تو نہ رکھتا تھا کہ یہاں کوئی تقریر کروں۔ چند ہی دن ہوئے کہ میں چارپائی سے اٹھا ہوں۔ ۶ دسمبر سے لے کر آج پانچ دن قبل تک میں صاحبِ فراش تھا۔ اسی وجہ سے لاہور تک موٹر میں آنے کی وجہ سے کمر میں درد ہو گیا ہے۔ آج کچھ حرارت بھی ہے' اس لئے میں امید نہ رکھتا تھا کہ کچھ بیان کر سکوں گا۔ مگر بعض دوستوں نے جب مجبور کیا کہ میں کرسی پر بیٹھوں اور یہ مجھے گراں گذرا کہ باقی دوست فرش پر بیٹھے ہوں اور میں کرسی پر بیٹھوں۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تقریر کروں۔ اسی طرح سب دوست دیکھ بھی لیں گے اور باتیں بھی سن لیں گے۔ میں نے اس سال سالانہ جلسہ کے موقع پر قرآن کی طرف دوستوں کو خاص طور پر توجہ دلائی تھی۔ اُس وقت بعض دوستوں نے کچھ سوالات کئے تھے اور رقعے لکھ کر دیئے تھے۔ چونکہ دوران تقریر میں جواب دینا اصل تقریر سے دوسری طرف متوجہ

ہو جانا ہوتا ہے اور یہ اصول رسول کریم ﷺ کی سنت کے بھی خلاف ہے۔ ایک دفعہ رسول کریم ﷺ کوئی بات کر رہے تھے کہ دوسرے شخص نے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اِس سے اُس نے سمجھا آپ ناراض ہیں۔ لیکن جب آپ نے کلام ختم کیا تو اسے بلایا اور فرمایا دورانِ کلام میں بات کرنا درست نہیں۔ اب میں نے وہ بات ختم کرلی ہے، تم جو بات کرنا چاہتے ہو کرو۔

میرا اپنا طریق یہ ہے کہ بعض دفعہ جب کوئی سوال موضوعِ تقریر سے گہرا تعلق رکھتا ہے تو میں اس کا جواب بیان کر دیتا ہوں۔ اور بعض اوقات جب سوال موضوعِ تقریر سے الگ ہوتا ہے، اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ جلسہ کے موقع پر جب میں تقریر کر رہا تھا تو ایک سوال اگرچہ قرآن کے متعلق کیا گیا تھا مگر میرے مضمون سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے میں نے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن چونکہ ممکن ہے وہ سوال اور لوگوں کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہو، اس لئے اب اس کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

سوال یہ تھا کہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ [1] کہ قرآن کو پاکیزہ اور مطہر لوگ ہی چھوئیں گے، دوسرے لوگ اس تک پہنچ نہیں سکیں گے۔ مگر ہم تو دیکھتے ہیں دنیا میں گندے سے گندے لوگ قرآن کریم کو ہاتھ لگا لیتے ہیں۔ عیسائی، ہندو، آریہ حتّٰی کہ خدا تعالیٰ کو گالیاں دینے والے اور شرعی طہارت کا قطعی خیال نہ رکھنے والے بھی قرآن کریم کو چُھوتے ہیں۔ عیسائیوں نے تو قرآن کریم چھپوائے بھی ہیں۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوا جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور عیسائی قرآن کریم چھپواتے، اسے فروخت کرتے اور اس کی تفسیریں لکھتے ہیں۔

بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ کوئی ناپاک انسان قرآن کریم کو چھو نہیں سکتا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ کوئی ناپاک انسان چھوئے نہیں۔ یعنی یہ حکم ہے اور اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ قرآن کریم کو باوضو ہاتھ لگایا جائے۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ گناہ گار ہے۔ لیکن نہ تو اس آیت کا یہ مفہوم ہے اور نہ سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ مفہوم درست ہے۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں اس بارے میں صحابہ میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں حائضہ عورت بھی قرآن کریم کو ہاتھ لگا سکتی ہے اور بہت سے ائمہ نے لکھا ہے حائضہ عورت پڑھ بھی سکتی ہے اور پڑھنا بھی مَسّ ہے کیونکہ قرآن کے الفاظ

ذہن میں سے گذرتے ہیں۔
بہرحال حائضہ کو کپڑے میں ہاتھ لپیٹ کر قرآن کریم کو چھونے یا بغیر کپڑے کے چھونے بلکہ پڑھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ پھر لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کا کیا مطلب ہوا۔ اس کے متعلق لوگوں کو بہت سی مشکلات پیش آئی ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے مجھے اس کے نہایت لطیف معنی سمجھائے ہیں۔ میرے نزدیک اس کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہیں کہ سچا اور حقیقی مس یہ ہوا کرتا ہے کہ اس چیز سے تعلق ہو جائے۔ مثلاً محاورہ ہے فلاں کو تو فلاں مضمون سے مس ہی نہیں۔ باوجود اس کے کہ ایک لڑکا مدرسہ میں جاتا ہے پورا وقت کلاس میں بیٹھتا ہے مگر استاد اس کے متعلق کہتا ہے اسے تو فلاں مضمون سے مَسّ ہی نہیں۔ کیا اس پر وہ طالب علم کہہ سکتا ہے کہ استاد کی یہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ میں روز مدرسہ جاتا ہوں' اس مضمون کی کتاب میرے ہاتھ میں ہوتی ہے پھر کیونکر مجھے اس مضمون سے مَسّ نہیں۔ بات یہ ہے' استاد کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے اس مضمون سے حقیقی لگاؤ نہیں۔ ان نتائج کو وہ حاصل نہیں کر سکتا جو اس مضمون کے پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کے ایک معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم اپنے ساتھ فوائد لایا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ جو میرے ساتھ تعلق پیدا کرے گا' وہ قیامت کو ہی نجات پا سکے گا۔ اگر قرآن کا صرف یہی دعویٰ ہو تو کوئی یہ کہہ سکتا ہے۔ مرنے کے بعد اگر کوئی فائدہ نہ ہوا تو پھر کیا کریں گے۔ قرآن کریم نے اس سوال کو یوں حل کیا ہے کہ کہتا ہے میں اپنے ماننے والوں اور سچا تعلق پیدا کرنے والوں کو اِسی دنیا میں انعامات کا وارث بنا دیتا ہوں۔ یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ اگلے جہاں میں بھی قرآن کے ماننے والوں کو نجات حاصل ہوگی۔

چنانچہ قرآن کریم اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے متعلق بتاتا ہے۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔[۲] کہ ایسے لوگوں کو دو باتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے لوگ ہدایت الٰہی پر سوار ہو جائیں گے۔ ہدایت پر سوار ہونے کا کیا مطلب ہے۔ یہ کہ جس طرح گھوڑا اپنے سوار کے ماتحت ہو جاتا ہے' جدھر سوار چاہے اسے پھیر لیتا ہے' اسی طرح ہدایت ایسے لوگوں کے تابع ہو جاتی ہے یعنی ایسے انسان کے ذریعہ ہدایت پھیلتی ہے۔ یہ قرآن کریم کی خاص خصوصیت ہے۔ دوسری مذہبی کتابیں تو یہ کہتی ہیں کہ ان کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن یہ کہتا ہے۔ اس کی تعلیم پر چلنے

والے کو یہ مقدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جدھر رُخ کرتا ہے' دنیا اس کے قدموں میں گرتی ہے۔

دوسری بات قرآن پر عمل کرنے والوں کے متعلق یہ بیان کی کہ **اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ**۔ جس مقصد کو لے کر وہ کھڑے ہوں گے' اسے ضرور پالیں گے۔ **مُفْلِحُوْنَ** کے یہ معنی نہیں کہ بڑے بن جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ قرار دے کر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں قرآن کو نہ ماننے والے دنیا میں حکومتیں کرتے ہیں' آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے ہیں' عزت و شوکت رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں قرآن کو ماننے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے' پھر مفلح کس طرح ہوئے۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے قرآن نے یہ نہیں کہا کہ میرے ماننے والوں کو حکومت مل جائے گی' سلطنت حاصل ہو جائے گی۔ ایک وقت اور ایک زمانہ کے لئے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت بھی ملے گی۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ دنیا کی حکومت ہی قرآن کی تعلیم پر چلنے والوں کا مقصد ہے۔ بلکہ یہ کہا ہے قرآن سے تعلق رکھنے والوں کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں روحانیت قائم کریں۔ اگر اس میں کوئی کامیاب ہو جائے تو وہ کامیاب ہو گیا' چاہے دنیا میں سب سے غریب ہی ہو۔

پس مُفلح کے یہ معنی نہیں کہ کوئی مادی چیز مل جائے۔ بلکہ جس مقصد کو لے کر کھڑا ہو' اس میں کامیاب ہونے والا مُفلح ہے۔ دیکھو حضرت امام حسینؓ مارے گئے اور بادشاہ نہ بن سکے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ناکام رہے' ہرگز نہیں۔ وہ کامیاب ہو گئے اور مُفلح بن گئے کیونکہ جس مقصد کو لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے' اس میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے سامنے یہ مقصد تھا کہ رسول کریم ﷺ کی نیابت کے بعض حقوق ایسے ہیں کہ جسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوں' انہیں پھر وہ چھوڑ نہیں سکتا۔ اس میں ان کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ ان کی شہادت کا یہ نتیجہ ہوا کہ گو بعد میں خلفاء ہوئے مگر ان کو خلفاء راشدین نہیں کہا گیا۔ کیونکہ حضرت امام حسین کی قربانی نے بتا دیا کہ خلافت بعض شرائط سے وابستہ ہے۔ یہ نہیں کہ جس کے ہاتھ میں بادشاہت آجائے وہ خلیفہ بن جائے۔ اس طرح دین کو بہت بڑی تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یزید کے سے انسان کے اقوال اور افعال پیش کر کے کہا جاتا یہ اسلام کے خلفاء کی باتیں ہیں۔ اور اس طرح دین میں رخنہ اندازی کی جاتی۔

پس اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والا مُفلح ہوتا ہے' خواہ ایک شہادت چھوڑ

سَو شہادتیں اسے حاصل ہوں۔ تو فرمایا اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ایسے انسان کو فلاح نصیب ہو جاتی ہے اور ہدایت اس کے ماتحت آ جاتی ہے۔ اس کے کلام میں تاثیر' برکت اور نور ہوتا ہے۔

یہ قرآن کا دعویٰ ہے۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے' ہدایت اس کے تابع ہو جاتی ہے اور وہ مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر ہم تو بہتیرے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں مگر ان کے متعلق یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔ مطہر لوگ ہی اس کے برکات اور فیوض سے حصہ پاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو مونہہ سے قرآن کے الفاظ نکالے' وہ فائدہ اٹھالے۔ یہ مس مطہر لوگوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔

پس یہاں مس سے مراد ظاہری طور پر چھونا نہیں' ایک نجاست سے بھرا ہوا انسان بھی قرآن کو چھو لیتا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہو گا تو گناہ گار ہو گا اور اگر کافر ہے تو وہ تو قرآن کو مانتا ہی نہیں۔ پس لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کی برکات' اس کے فضائل اور اس کی رحمتوں سے حصہ نہیں پاتے مگر مطہر لوگ۔ جو لوگ اس کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں وہی اس کی برکات اور رحمتوں سے حصہ پاتے ہیں۔ ایک معنی تو اس کے یہ ہیں۔ ایک اور معنی ہیں جو علمی طور پر نہایت عظیم الشان ہیں۔ اور وہ یہ ہیں دنیا میں کئی ایک کتابیں پائی جاتی ہیں۔ جو اس بات کی مدّعی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ ایسی کتابیں ہندوؤں' عیسائیوں' زرتشتیوں وغیرہ کی ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی مدعی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن کو ان کتابوں پر کیا فضیلت ہے کہ ان کو چھوڑ کر اسے مانا جائے۔ وہ بھی اس بات کی دعویدار ہیں کہ خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ اور قرآن کا بھی یہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے لئے تو اس لحاظ سے بھی مشکل ہے کہ قرآن نے تسلیم کیا ہے کہ خدا کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے کتابیں آتی رہی ہیں۔ اس طرح ان کتابوں کا پلّہ بھاری ہو گیا کہ قرآن نے بھی ان کے آنے کی تصدیق کر دی۔ مگر ان کتابوں کے ماننے والے قرآن کو نہیں مانتے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں کونسی کتاب مانی چاہئے جبکہ بظاہر قرآن کی اپنی تصدیق سے ان کتابوں کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔

قرآن نے اس بات کے لئے کہ یہی کتاب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے جسے ماننا چاہئے جو

دلائل دیئے ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے جو اس آیت میں بیان ہے۔

یہ سیدھی بات ہے کہ ہر انسان اپنا خزانہ اور اپنی قیمتی چیزیں اپنے پیاروں کے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ مثلاً انسان اپنی جائداد اپنے وارثوں کے لئے قرار دیتا ہے۔ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کی جائداد پر قابض ہو جائیں اور اس کے وارث محروم رہ جائیں۔ اسی طرح سلطنتیں چاہتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اموال ان کے ملک میں ہوں' اسی بات کے لئے لڑتی ہیں۔ ہندوستان میں اسی لئے شورش پیدا ہوتی رہتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں دوسرے ملک کے لوگ ہمارے ملک سے اموال لے جا رہے ہیں۔ ان اموال سے ہمارے ملک کے لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ورنہ سیدھی بات یہ ہے کہ اگر لنکا شائر بند ہو جائے تو کپڑے کے کارخانے ہندوستان کے زمیندار نہیں چلالیں گے' بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہی ایسے کارخانوں کے مالک ہوں گے اور ممکن ہے اب جو کپڑا سستا ہے' اس وقت لوگوں کو مہنگا ملے مگر شور مچانے کے لئے وہ بھی تیار ہیں اور کہتے ہیں ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔ اگر اہل ہند کو حکومت مل جائے تو زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار لوگ پارلیمنٹ کے ممبر بن جائیں گے اور باقی سارے لوگ ان کے جوئے کے نیچے ہوں گے۔ مگر وہ بھی حکومت کے ایسے ہی شائق ہیں جیسے وہ لوگ جو اس بات کے امیدوار ہیں کہ وہ پریذیڈنٹ بن جائیں گے یا کوئی اور بڑا عہدہ حاصل کر لیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ لوگ اپنے ملک کا خزانہ اپنے لوگوں کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ مذہبی کتب بھی بطور خزانہ ہوتی ہیں۔ جس طرح جسمانی خزانے ہوتے ہیں' اسی طرح روحانی خزانے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کو کہیں شفاء قرار دیا گیا ہے' کہیں پانی سے تشبیہہ دی گئی ہے جس سے کھیتیاں اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں یہ قانونِ قدرت بلکہ قانون فطرت ہے کہ اپنا خزانہ اپنوں کو دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب اگر قرآن خدا تعالیٰ کی کتاب ہے اور یہ روحانی خزانہ ہے تو ضرور ہے کہ یہ خزانہ انہیں کو ملے جو اس سے حقیقی تعلق رکھنے والے ہوں اور یہ انہیں کے لئے کھلے جن کو اس کے کھولنے کی جستجو اور شوق ہو۔ اگر اس کے خلاف ہو اور یہ خزانہ اس کے مخالفوں پر کھلے تو یہ خدا تعالیٰ کی کتاب نہیں ہو سکتی۔ انسانی کتابوں میں تو یہ ہوتا ہے' گورنمنٹ ایک قانون بناتی ہے مگر اس قانون کو گورنمنٹ کی نسبت دوسرے زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کئی بار "پاؤنیر" اور "سول" نے لکھا ہے۔ مسٹر جناح قوانین سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے' اس لئے گورنمنٹ کے وزراء کو

دبا لیتا ہے۔ چونکہ گورنمنٹ کا قانون انسانی کلام ہوتا ہے اس لئے اس کا مخالف موافقین کی نسبت اس کی زیادہ باریکیاں سمجھ سکتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کا کلام جو برکت اور انعام کے طور پر نازل ہوتا ہے' اسے خدا تعالیٰ سے تعلق نہ رکھنے والے زیادہ عمدگی سے سمجھ سکیں تو وہ برکت کہاں رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آسمانی کتاب کے پرکھنے کا گُر بتایا ہے۔ آسمانی کتاب بطور رحمت' برکت اور نعمت کے نازل ہوتی ہے۔ اگر غیر لوگ جنہوں نے اس کے احکام کا جوا اپنی گردنوں پر نہیں رکھا' اس کے ماننے والوں سے زیادہ اس کی باریکیاں سمجھ لیں تو معلوم ہوا اس خزانے کو دوسرے لے گئے۔ اس لئے فرمایا اس خزانہ پر ایسے محافظ ہیں کہ یہ ماننے والوں کے لئے ہی کھلتا ہے' دوسروں کے لئے نہیں۔ مگر انجیل کو دیکھ لو اس کے مفسر وہی لوگ ہیں جنہیں انجیل کے مطابق روحانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل نہیں ہیں' یہی حال ویدوں کا ہے۔ مگر قرآن کریم کے علوم میں وہی لوگ آگے بڑھے جو تقویٰ اور طہارت میں بھی اعلیٰ تھے۔ علماء نے قرآن کریم کی جو تفسیریں لکھی ہیں' آج مسلمان انہیں چھپائے پھرتے ہیں تاکہ غیر مذاہب کے لوگ ان کی بناء پر اعتراض نہ کریں۔ لیکن صوفیاء نے وہ وہ باتیں لکھی ہیں جو اس وقت دنیا کو معلوم نہ تھیں اور اب معلوم ہو رہی ہیں۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ موجودہ دنیا کی عمر پانچ چھ ہزار سال ہے۔ مگر ابن عربی نے کہا مجھے کشف میں بتایا گیا ہے کہ کئی لاکھ سال سے یہ دنیا ہے اور کئی لاکھ سال سے یہ بنتی چلی آ رہی ہے۔ اب یورپین لوگ ایولیوشن (EVOLUTION) تھیوری کے ماتحت یہی مان رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے یہ تھیوری ایجاد کی حالانکہ اس کے اصل موجد ابن عربی ہیں۔

اسی طرح ظاہری علماء یہ کہتے رہے کہ غیر تو غیر جو مسلمان بھی دوزخ میں جائے گا' وہ پھر نہیں نکلے گا مگر ابن عربی کہتے ہیں۔

خدا کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ شیطان بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ میں نہیں رہے گا اور قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے۔ پھر عام مفسر تو کہتے رہے کہ سورۃ نجم کی آیات میں شیطان نے یہ فقرات داخل کر دئے تھے۔ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی۔ [۳] کہ کچھ دیویاں ایسی ہیں جن کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ یہ شرک کا کلام شیطان نے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر قرآن کریم پڑھتے ہوئے جاری کر دیا۔

پھر کہتے ہیں۔ سورۃ حج کی ایک آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے ردّ کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان کے مقابلہ میں ابن عربی نے اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ شیطان انبیاء کے رستہ میں روڑے اٹکاتا ہے اور خدا تعالیٰ ان کو دور کر دیتا اور نبی کو کامیاب کر دیتا ہے۔ غرض ایک ایک بات صوفیا کی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح انہوں نے بالکل صحیح اور درست کہی۔

اسی سلسلہ میں اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آج جو ترقیاں فلسفہ' اخلاق' تاریخ وغیرہ کی بیان کی جاتی ہیں' یہ سب کچھ پہلے قرآن کریم میں بیان ہو چکی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فلسفہ اخلاق کی ایسی تھیوریاں بیان کی ہیں کہ پہلے لوگ ان کے خلاف تھے۔ لیکن اب امریکہ والوں نے وہ باتیں لکھی ہیں تو ان کی بڑی تعریف کی جا رہی ہے' حالانکہ ان سے پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے وہ باتیں نہایت وضاحت سے لکھ دی ہیں۔

بادلوں کے متعلق پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ سمندر سے پانی پی کر آتے اور برستے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں صاف لکھا ہے پانی سے بخارات ہوائیں اٹھاتی اور پھر بادل بوجھل ہوتے اور برستے ہیں۔ بدی اور نیکی کی صحیح تشریح سے پہلے لوگ واقف نہ تھے۔ اب قرآن کریم سے یہ سب کچھ معلوم ہوا ہے مگر یہ باتیں کسی ایسے انسان نے بیان نہیں کیں جو دنیاوی علوم کے لحاظ سے بڑا عالم ہو۔ بلکہ اس شخص نے بیان کی ہیں جس نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی اور جس کے متعلق مخالف یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ وہ صحیح اردو بھی نہیں لکھ سکتا۔ بات یہ ہے قرآن کریم کے علومِ ظاہری علم سے وابستہ نہیں بلکہ نیکی اور تقویٰ سے وابستہ ہیں۔ آج سے تیس سال قبل بہت سے لوگ ایسے تھے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے انہیں اردو بھی نہیں آتی اور عربی دوسروں سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں مولوی نورالدین آپ کو کتابیں لکھ کر دیتے ہیں۔ خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی یہ دعویٰ نہ تھا کہ آپ نے ظاہری علوم کہیں پڑھے۔ آپ فرمایا کرتے میرا ایک استاد تھا جو افیم کھایا کرتا تھا اور حقہ لے کر بیٹھ رہتا تھا۔ کئی دفعہ پینک[۶] میں اس کے حقے کی چلم ٹوٹ جاتی۔ ایسے استاد نے پڑھانا کیا تھا۔ غرض آپ کو لوگ جاہل اور بے علم سمجھتے تھے۔ کئی لوگ اس بات کے مدعی تھے کہ آپ کو کئی سال پڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اب اس سوال کو جانے دو کہ آپ نے دنیا میں کیا تغیر پیدا کیا۔ مگر اس میں شُبہ نہیں کہ سارا اسلامی

عالم اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو بَلاءِ تعصّب میں حد سے زیادہ مبتلا ہو چکے ہیں کہ اسلام کے دشمنوں کو شکست دینے والے یہی لوگ ہیں جو احمدی کہلاتے ہیں۔

میرے ایک سسرال سے غیر احمدی رشتہ دار ہیں۔ جو معزّز عہدیدار ہیں۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ قرآن کریم کے مطالب کو بگاڑنے والا تم سے بڑھ کر کوئی نہیں مگر میں یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کے دشمنوں کا سر کُچلنے کے لئے آپ کی باتیں بہت کارگر ہیں۔ میں نے کہا عجیب بات ہے۔ قرآن بگاڑ کر دشمنانِ اسلام کا سر کُچلتا ہے' یوں نہیں کچل سکتا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا مجھے آپ اس خط کا جواب نہ لکھیں۔ شائد انہوں نے یہ اس لئے لکھا کہ انہوں نے سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ انہوں نے سمجھا ہو گا میں بھی انہیں سخت جواب دوں گا' حالانکہ میں ایسا نہ کرتا۔

غرض حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم کے جو علوم ظاہر کئے ہیں' وہ سمندر ہیں اور دشمن بھی انہیں تسلیم کرتے ہیں۔ جب ترجمۃ القرآن کا پہلا پارہ انگریزی میں قادیان سے شائع ہوا تو فورمین کرسچین کالج لاہور کے پرنسپل اور وائی۔ ایم۔ سی اے کے سیکرٹری مجھ سے ملنے کے لئے قادیان آئے' انہوں نے مختلف امور کے متعلق گفتگو کی۔ انہیں وہ پارہ دیا گیا۔ اس وقت تو انہوں نے اس کے متعلق کچھ نہ کہا لیکن بعد میں سیلون میں تقریر کی جس میں بیان کیا۔

> "اسلام اور عیسائیت کا فیصلہ ازہر وغیرہ میں نہیں ہو گا جن کی طرف لوگوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ بلکہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں ہو گا جہاں سے میں ابھی ہو کر آیا ہوں اور جہاں سے قرآن کا ترجمہ شائع ہونا شروع ہوا اور وہ قادیان ہے۔ اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کی کیا حالت ہے"۔
>
> "اسی طرح امریکہ کا ایک رسالہ ہے جس نے لکھا جب یہ ترجمہ مکمل ہو گیا جو قادیان سے شائع ہونا شروع ہوا ہے تو اس وقت اس بات کا فیصلہ ہو گا کہ دنیا کا آئندہ مذہب اسلام ہو گا یا عیسائیت۔"

یہ تو مخالفینِ اسلام کی آراء ہیں۔ ادھر مسلمان بھی جو آپ کو جاہل اور بے علم کہتے تھے' ان میں سے اکثر یا تو یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ قرآن کریم کی وہ خدمت آپ نے کی ہے جو اور کسی نے اس زمانہ میں نہیں کی۔ یا یہ کہ قرآن کو تو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں مگر غیر مذاہب کے

مقابلہ میں اسلام کی فتح انہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے **لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ** خواہ کوئی ظاہری علوم میں کتنا بڑھ جائے جب تک تقویٰ و طہارت حاصل نہ کرے گا علوم قرآنیہ میں بچہ ہی ہو گا۔ وہی ان علوم کا ماہر ہو گا خواہ وہ دینوی علوم نہ رکھتا ہو جو روحانی پاکیزگی رکھتا ہو گا۔ اس پر ایسے علوم کھولے جائیں گے کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔

پس قرآن کریم سچائی کا یہ معیار بتاتا ہے کہ جو خدائی کتاب ہو' اس کے علوم روحانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم اس صداقت کو آج بھی پورا ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ میں ہی ہوں میں نے ہائی سکول میں پڑھا مگر کسی جماعت میں پاس نہ ہوا۔ حساب سے مجھے مَسّ ہی نہ تھا۔ عربی میں قرآن کریم کا خالی ترجمہ حضرت خلیفہ اول نے پڑھایا اور باوجود اس کے کہ مجھے بہت کم عربی آتی تھی' آدھا پونا پارہ روزانہ پڑھا دیتے اور فرماتے ایک دفعہ قرآن میں سے گذر جاؤ۔ اسی طرح بخاری میں سے انہوں نے گذار دیا۔ اگر میں کوئی سوال کرتا تو فرماتے میاں یہ باتیں خود خدا سکھائے گا۔ اسی طرح میرے سوال کو ٹال دیتے۔ کبھی خود کچھ بتانا چاہتے تو بتا دیتے' میرے سوال پر کچھ نہ بتاتے۔ اس طرح پڑھا کر فرمانے لگے مجھے جو کچھ آتا تھا' میں نے تمہیں سکھا دیا ہے اس وقت تو میں نہ سمجھ سکا کہ کس طرح وہ سب کچھ سکھا دیا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اس فقرہ میں انہوں نے سب کچھ سکھایا کہ خدا خود سکھاتا ہے۔

اگر دل پاکیزہ ہو' خدا تعالیٰ سے تعلق ہو تو خدا تعالیٰ قرآن کریم کے علوم خود سکھاتا ہے۔ چنانچہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ جب حج کے لئے جانے لگا تو حضرت خلیفہ اول نے فرمایا میں نے کبھی پہلے یہ بات ظاہر نہ کی تھی تاکہ تمہاری ترقی میں روک نہ ہو۔ اب ظاہر کرتا ہوں کہ یوں تو میں نے تمہیں قرآن پڑھایا لیکن کئی معارف قرآنیہ تم سے سنے اور یاد رکھے۔ اور اس طرح تم سے قرآن پڑھا۔ اب چونکہ تم جا رہے ہو۔ اس لئے سنا دیا ہے کہ شاید پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ تو میرا دعویٰ ہے کہ دنیا کا کوئی شخص اٹھے جو یہ کہے کہ میں قرآن کے معارف اور حقائق بیان کرنے میں مقابلہ کرنا چاہتا ہوں تو میں اس سے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ وہ خود تسلیم کرے یا نہ کرے' دنیا اور حقائق پسند دنیا تسلیم کرے گی کہ جو حقائق اور معارف میں نے بیان کئے ہوں گے' وہ بہت بڑھ کر ہوں گے۔

تو قرآن کا علم محض خدا تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کریم کی بہت بڑی صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ جس کتاب کا علم خدا کے فضل سے حاصل ہو' وہی خدا کی

کتاب ہو سکتی ہے۔ جسے خدا تعالیٰ اپنے کلام کے حقائق سے واقف ہونے کا مستحق سمجھتا ہے' اس پر علم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ لیکن جو خدا تعالیٰ سے دور ہوتا ہے' اسے یہ کتاب ایسی ہی بدنما لگتی ہے جیسی پنڈت دیانند صاحب کو لگی کہ انہیں اس میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آئی۔

وہ لوگ جو ظاہری علوم کے بڑے بڑے دعوے رکھتے تھے' حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مقابلہ میں قرآن کریم کے نکات بیان کرنے میں ایسے ہی ہیچ تھے جیسے کمزور دماغ کا انسان ایک اعلیٰ دماغ کے انسان کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ وہ سوائے اس کے کہ یہ کہتے رہے غلط تاویلیں کرتے ہو' قرآن کو بگاڑتے ہو اور کچھ نہ کر سکے۔ آج انہی کی ذرّیتیں اور ان کے ساتھی تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ نے جو حقائق بیان کئے وہ کسی نے بیان نہیں کئے۔

عجیب بات ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے قبل سرسید نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنی شروع کی۔ اور قرآنی مطالب کو اس طرح پیش کیا کہ وہ نئی تعلیم کے مطابق معلوم ہوں۔ اس کے مقابلہ میں حضرت مسیح موعود نے کئی آیات کی ایسی تشریح بیان کی کہ اس وقت یورپ کی تحقیقات اس کے خلاف تھی۔ مگر اب حضرت مسیح موعود کی بیان کردہ کئی باتوں کی تصدیق اہل یورپ بھی کرنے لگے ہیں اور کئی ابھی باقی ہیں۔ کیا عجیب بات نہیں کہ ان کی باتیں تو مٹی جا رہی ہیں جنہوں نے زمانہ کے حالات کے مطابق کہی تھیں مگر حضرت مسیح موعود کی فرمودہ باتیں اب مخالف بھی مانتے جا رہے ہیں۔

غرض لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ سچے کلام الٰہی کے پرکھنے کا معیار ہے کہ جتنا کوئی باطنی علوم میں ترقی کرے گا' اتنا ہی زیادہ اس کلام کے سمجھنے میں ترقی کرے گا۔ جس کتاب کے متعلق یہ بات پائی جائے گی وہی خدا کی طرف سے ہوگی۔

یہ دوسرے معنی ہیں اس آیت کے۔ یہ معنی نہیں کہ کوئی ناپاک ہاتھ قرآن کو نہیں لگا سکتا۔ یہ مَسّ تو رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے۔ مسلمان ہونے سے قبل انہوں نے بہن سے قرآن مانگا' انہوں نے باوجود ان کے مشرک ہونے کے ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی حقیقت پر واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی محبت اپنے دل میں پیدا کرے اور تقویٰ و طہارت اختیار کرے۔ آگے اس کے کئی مدارج ہیں۔ کئی لوگ ہوتے ہیں جو اعلیٰ درجہ کو سامنے رکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں اور سمجھ لیتے

ہیں ہم اس درجہ کو حاصل نہیں کر سکتے۔ جیسے تندرستی اور صحت کے مدارج ہوتے ہیں' اسی طرح روحانیت کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اور ہر درجہ کے ساتھ معارف تعلق رکھتے ہیں۔ جتنا جتنا کوئی درجہ پاتا جاتا ہے' اتنے ہی زیادہ اعلیٰ معارف سمجھنے کی اس میں قابلیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگر باوجود کسی کی کوشش اور سعی کے اس میں کمزوری رہ جائے تو اس کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ایک سپاہی اپنی طرف سے پوری ہمت اور بہادری سے لڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ جرنیل کی طرح کام نہیں کر سکتا تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے ملک کی خدمت نہیں کی۔ اس نے ضرور کی ہے مگر اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق۔ پس اگر کسی میں تقویٰ و طہارت حاصل کرنے کی خواہش اور تڑپ رکھنے کے اور کوشش کرنے کے باوجود کوئی کمزوری رہ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اس کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اسے بھی اس کا بدلہ دیتا ہے تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اور وہ اور زیادہ کوشش کرے۔

پس کسی کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے' کوشش کرنی چاہئے کہ طہارت اور کوشش کرے۔ خدا تعالیٰ نے اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ میں یہی بتایا ہے۔ کہ جب انسان میں اخلاص پیدا ہوتا ہے تو اسے سواری ملتی ہے جو اسے آگے لے جاتی ہے۔ اسی طرح اسے اور ترقی ملتی ہے۔ پھر وہ سواری اور آگے لے جاتی ہے۔

(الفضل ۵ فروری ۱۹۲۹ء)

---

[۱] الواقعة:۸۰ [۲] البقرة:٦

[۳] تفسیر روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ استنبول ۱۹۲۶ء

[۴] پینک: افیون یا پوست کے نشہ کی اونگھ